محمد فاروق قریشی

سانحۂ پشاور، علماء اور دینی مدارس

۱۶؍دسمبر قومی تاریخ کا کرب ناک استعارہ ہے کہ اسی روز ۱۹۷۱ء میں پاکستان دولخت ہوا تھا۔ امسال اس دن نے اک اور قیامت ڈھائی کہ سانحۂ پشاور نے پوری قوم کو تڑپا دیا، رُلا دیا۔ پھول سے بچوں کو خاک وخون میں تڑپا کر سفاکیت کی ایسی مثال قائم کی گئی کہ اس کی نظیر ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتی۔ ایک عشرہ ہو چلا ہے لیکن قوم کا ہر فرد ہنوز اس کرب سے بے چین ہے۔ مجموعی طور پر قوم کے تمام طبقات نے اس سانحہ کی پرزور مذمت کی ہے اور ہر شخص نے اپنے انداز واستعداد کے مطابق سوگ منایا ہے۔ یہاں پر دو باتیں قابل غور ہیں۔

غم اور خوشی انسانی زندگی کے اہم ترین پہلو ہیں جن کے بارے میں ہر مذہب نے تعلیمات واضح کی ہیں اور اس کے انداز واطوار کے بارے میں مختلف تہذیبوں کے بھی متنوع مظاہر ہیں۔ اسلام کہ دین فطرت ہے لہٰذا انسانی فطرت کے اس اہم پہلو کے بارے میں انتہائی وضاحت وصراحت کے ساتھ مسائل کے طریق بیان کر دیے گئے ہیں۔ اظہارِ غم کے لیے سوگوار ہونا اور رونا عین فطرت ہے، اس لیے شریعت نے قدغن نہیں لگائی لیکن آہ و بکا کے ساتھ ماتم کی اجازت نہیں دی۔ مرحومین کے غم میں گریہ کے ساتھ اللہ کی امانت اس کے سپرد کرنے کا تصور کرتے ہوئے اللہ کی رضا پر راضی ہونے کا مظاہرہ اسلامی تہذیب کا خاصہ ہے۔ مرحوم کی مغفرت و بلندیٔ درجات اور متعلقین کے صبر کی دعا وتعزیت اسلامی تمدن کے مظاہر ہیں۔ دیگر مذاہب اور اقوام کے انداز وطریق اسلامی تہذیب سے مختلف ہیں۔ عموماً دیگر مذاہب میں تعزیت کے لیے پھولوں کے گلدستے اور دیے روشن کرنے کا رواج ہے۔ سانحۂ پشاور میں مسلمان بچے شہید ہوئے جن کی تعزیت کے لیے ملک میں غیر مسلم کمیونٹی نے اپنے طریق کے عین مطابق شمعیں روشن کر کے دلی تعزیت اور جذبات کا اظہار کیا جب کہ بیرون ملک دنیا بھر میں شہداء پشاور کے اظہارِ غم میں دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے یکجہتی کا مظاہر کیا گیا۔ اقوام عالم کے اظہارِ غم پر پاکستانی قوم ان کی شکر گزار ہے۔ پاکستان میں بھی دیگر مذاہب وغیر مسلم اقوام کے علاوہ جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے شرعی طریقے پر دعاءِ مغفرت کرنے کی بجائے گلدستے رکھنے اور شمعیں جلا کر اظہار تعزیت کرنے کا چلن اپنایا۔ ملک میں شاید ہی کوئی علاقہ ایسا ہو جہاں پر ایسا نہ ہوا ہو۔ حیرت ہے کہ روشن خیال اور لبرل ازم کے نام پر اچھے خاصے تعلیم یافتہ حضرات وخواتین اسلامی تعلیمات اور تمدن سے اعراض کرتے ہوئے مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھل کر دیگر مذاہب کی روایات کو معاشرے میں پروان چڑھانے کی روش پر گامزن ہیں۔ اسلامی تمدن کے مقابل مغربی تہذیب کے فروغ میں حسب روایت میڈیا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ معمولی تعلیم یافتہ اینکر اور مخصوص ڈگر پر

گامزن نمائندگان تہذیبی تصادم میں شعوری یا لاشعوری طور پر مغربی تہذیب کی نمائندہ صف میں نظر آتے ہیں۔ رائے عامہ تشکیل دینے کے شعبہ کے ذمہ دار حضرات کو اپنے رویہ پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

سانحۂ پشاور نے جسدِ ملّی پر ایسا چرکا لگایا ہے کہ ہر فرد بلبلا اُٹھا ہے اور ہر طبقہ نے اس سفاکی اور بہیمیت کی پرزور مذمت کی ہے۔ قابل افسوس امر یہ ہے کہ اس دل دوز واقعہ کی آڑ میں کچھ لوگ اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا اہتمام کرنے لگے ہیں۔ دین بے زار طائفہ اور فرقہ وارانہ ذہنیت سے آلودہ گروہ تو اپنی طبعی خاصیت کے باوصف منافرت آمیز روش پر مجبور ہیں لیکن جدید تعلیم یافتہ اور روشن خیالی کی علم بردار ''سول سوسائٹی'' کا انداز بھی قابلِ دید ہے کہ قومی سوگ کی کفیت کو علماء اور دینی مدارس کے خلاف استعمال کرنے پر اس قدر مصر ہے کہ گویا ''اب یا کبھی نہیں'' کی صورت حال درپیش ہے۔ سانحۂ پشاور کے بعد دہشت گردی کے خلاف قومی یکجہتی کی فضا کو مخصوص ایجنڈے کی تکمیل کا ذریعہ بنانے کی کوشش معصوم شہداء کے لہو کو رائیگاں کرنے کی مذموم سازش ہے۔

کسی بھی اچھے یا برے واقعہ کی ستائش و مذمت قومی طبقات کی اجتماعی روش پر منحصر ہوتی ہے۔ سانحۂ پشاور کی مذمت میں دیگر طبقات کی طرح علماء اور دینی مدارس کے تمام وفاق کے نمائندہ حضرات نے دلی افسوس اور شدید مذمت کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باوجود صرف علماء کے طبقہ کو نشانہ بنایا ہوا ہے کہ اس طائفہ کے فلاں فرد نے حسب منشا انداز مذمت اختیار نہیں کیا۔ واقعہ کے اثبات و نفی سے قطع نظر یہ صورت حال اس قدر حیرت انگیز ہے کہ اپنے چبائے ہوئے لقمے دوسرے کے منہ میں ڈالنے پر اصرار کیا جارہا ہے۔ معاشرے میں کسی فرد سے ذاتی رائے اختیار کرنے کا حق کیسے سلب کیا جا سکتا ہے؟ علماء پر قدامت پسندی اور رجعت پرستی کے طعنہ بردار گروہ کا مؤقف یہی تو ہے کہ یہ طبقہ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرتا اور اپنے مؤقف پر قائم رہتے ہوئے انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ عجب معاملہ کہ ضد اور بے جا اصرار کی روش خود اپنالیں تو بھی روشن خیالی اور آزادروی پر کوئی حرف نہیں آتا

تمھاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامۂ اعمال میں تھی

دہشت گردوں کے چہروں پر داڑھی ہونا بھی گویا دین کی نمائندہ علامت ہے حالانکہ دیگر مذاہب کے لوگوں میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اس لیے علماء اور دینی مدارس کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا مہم جاری ہے۔ میڈیا کے تمام چینلز ''اس کارِ خیر'' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک بقراط ایسی ایسی لن ترانی کا مظاہرہ کررہا ہے کہ علم و دانش ہی نہیں سنجیدگی و متانت نے بھی ورطۂ حیرت میں سر پیٹ لیا ہے۔

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے
خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا کہیے

چہرے مہرے کی مماثلت ومشابہت کی بنیاد پر کہا جارہا ہے کہ دہشت گردوں کا بشرہ دینی مدارس کے طلباء سے میل کھاتا ہے لہٰذا دینی مدارس کو بند کر دیا جائے کہ قصہ تمام ہو جائے، یعنی نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ اس مؤقف کو دلیل ماننے میں قباحت یہ ہے کہ پھر دیکھنا ہوگا کہ جیلوں میں محبوس مجرموں کا سلسلۂ نسب کیا ہے اور وہ کن اداروں سے متعلق رہے ہیں؟ پھر ہر متعلقہ ادارے کو زمیں بوس کرنا ہوگا کہ جرم کی بیخ کنی کے لیے ان کی مادرِ علمی کے وجود کو ختم کرنا ضروری قرار پایا ہے۔ یہ سلسلہ تو طول شب ہجراں سے بھی کئی ہاتھ بڑا ہوگا۔ سردست موجودہ پھانسی پانے والے بدنصیبوں کا پس منظر معلوم کر کے فیصلہ کر لینا چاہیے۔ ایسا کرنے کی کوئی ہمت رکھتا ہے یا محض خواہش نفس کو دلیل بنا کر آسودہ خیال کا اہتمام مقصود ہے؟

دینی مدارس کا وجود عہد انگریز سے ہی استعماری قوتوں کے لیے تازیانہ بنا ہوا ہے۔ ایک مدت سے مغربی ممالک اور لادین عناصر مدارس کے وجود کو مٹانے کے درپے ہیں۔ افسوس کہ ہمارا نوجوان طبقہ، دین سے بیگانہ ماحول کی بنا پر اس مسموم پروپیگنڈا سے متاثر ہو رہا ہے۔ پاکستان میں ایوب خان سے لے کر پرویز مشرف تک اکثر حکمرانوں نے بقدر توفیق اس مہم کو سر کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اسلامیان پاکستان نے ان کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہونے دی۔ مدارس کے نصاب کی تبدیلی اور جدید علوم کی تعلیم کے اجراء کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ سرکاری نظم کے تحت قائم پروفیشنل تعلیمی ادارے اپنے خاص موضوع کی تعلیم کے لیے مختص ہیں لیکن وہاں دیگر علوم کی تعلیم کے بارے میں کہیں سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی اس لیے کہ اسے قومی ضرورت خیال کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات محل نظر ہے کہ کیا دینی تعلیم کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو اس ضرورت کو پورا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس باب میں حکومت نے اپنی ذمہ داریوں کا کس قدر پاس کیا ہے؟ اس کی گواہی گزشتہ سڑسٹھ برس کی تاریخ کا ایک ایک لمحہ دے رہا ہے۔ حکومت کے اعراضِ مسلسل کی صورت میں علماء اور غیر ریاستی ادارے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو یہ عمل قابلِ تحسین ہونا چاہیے لائق نفرین نہیں۔ سرکاری اور غیر ریاستی حلقوں کی طرف سے دینی مدارس میں نصاب کی تبدیلی کا مطالبہ بھی بوالعجبی کے سوا کچھ نہیں۔ کیا سرکاری بجٹ پر چلنے والے تعلیمی اداروں کا نصابِ تعلیم قومی مزاج اور ضرورت سے ہم آہنگ ہے؟ سرکاری اداروں کے علاوہ غیر ریاستی نظم کے تحت جاری تعلیمی ادارے مختلف نصابوں پر کاربند ہیں اور حکومت اس ضمن میں کوئی کارآمد پالیسی اختیار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس صورت حال میں صرف دینی مدارس کے نصاب پر حرف زنی اور مداخلت اپنی حیثیت سے زیادہ وزن اٹھانے اور دخل در معقولات کے مترادف ہے۔

☆.....☆.....☆